رسائل و مسائل

معراج رات کو ہوئی تھی یا دن کو؟

سوال:- پچھلے دنوں جیل جانے کا اتفاق ہوا۔ مختلف الخیال لوگوں میں مقصد کی یکسانیت اور لگن تھی۔ درس قرآن اور نماز باجماعت کا انتظام تھا۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے علماء حضرات وہاں بھی فروعی مذہبی اختلافات میں مبتلا تھے۔ ہماری بیرک میں تین الگ الگ جماعتیں دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث حضرات کراتے تھے۔ میں نے دوستوں سے مشورہ کیا کہ علماء حضرات کو مل کر ایک جماعت پر رضامند کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک دیوبندی عالم کے پاس گئے۔ انہیں میرے متعلق علم تھا کہ یہ جماعت اسلامی کا رکن ہے۔ ابھی تمہیداً کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ انہوں نے آپ کے بارے میں اعتراض شروع کر دیے کہ مولانا مودودی صاحب نئی نئی باتیں نکال لاتے ہیں۔ کسی پچھلے ترجمان میں مولانا نے لکھا ہے کہ واقعۂ معراج دن کی پوری روشنی میں رونما ہوا تھا، حالانکہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ واقعہ رات کے کسی حصہ میں پیش آیا اور حدیث سے بھی ثابت ہے کہ معراج عشاء اور فجر کے درمیان ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنانچہ الصّلوٰۃُ جامعۃٌ والا مقصد تو باتوں ہی میں ختم ہو گیا اور گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔

جیل سے واپسی پر میں نے ترجمان کے پچھلے پرچے دیکھے۔ جنوری ۱۹۷۶ء کے شمارے میں صفحہ ۱ پر آپ کی تحریر دیکھی:

"...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشاہدہ اندھیرے میں، یا مراقبے کی حالت میں، یا خواب میں، یا نیم بیداری کی حالت میں نہیں ہوا تھا، بلکہ صبح روشن طلوع ہو چکی تھی، آپ پوری طرح بیدار

تھے، کھلی فضا میں اور دن کی پوری روشنی میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر ٹھیک اسی طرح دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی شخص دنیا کے دوسرے مناظر دیکھتا ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کا اعتراض اسی عبارت پر تھا۔ بہتر ہو کہ آپ اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب:۔ معراج کے بارے میں یہ بات میں نے کبھی کہی، نہ لکھی، اور نہ میرے دماغ میں کبھی یہ خیال آیا کہ یہ واقعہ دن کے وقت پیش آیا تھا۔ تفہیم القرآن جلد دوم، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کا ترجمہ اور اس پر میرا مفصل حاشیہ دیکھ لیں۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ میرے نزدیک معراج رات کو ہوئی تھی یا دن کو۔

سورۂ نجم کی آیات ۴ تا ۱۲ میں جبریل علیہ السلام سے حضورؐ کی پہلی ملاقات کا ذکر ہے، جس کا معراج سے کوئی تعلق نہیں۔ اُسی کے متعلق میں نے لکھا ہے کہ یہ مشاہدہ دن کی روشنی اور پوری بیداری کی حالت میں ہوا تھا۔ تفہیم القرآن جلد پنجم (صفحات ۱۸۸ - ۱۸۹ - اور ۱۹۳ تا ۲۰۰) میں اس کی پوری تشریح موجود ہے۔

رہی وہ بحث جو جنوری ۱۹۵۷ء کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۱۰ پر کی گئی ہے تو اس کا عنوان "جبریلؑ سے حضورؐ کی پہلی ملاقات زمین پر" خود ہی صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ آسمان والی ملاقات کا ذکر نہیں ہے۔ اس پوری بحث کو آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ معراج کے سلسلے میں یہ بحث صرف اس لیے کی گئی ہے کہ ایسے غیر معمولی مشاہدات پر حضورؐ کے مبتلائے شک نہ ہونے کی وجہ کیا تھی۔ اس سے آگے سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ سے حضورؐ کی دوسری ملاقات کا ذکر صفحہ ۱۲ پر ہے۔ اسے بھی پڑھ کر دیکھ لیں کہ سلسلۂ بیان کیا ظاہر کر رہا ہے۔

درحقیقت اِن حضرات کی عادت یہ ہے کہ کسی شخص کی کسی عبارت کا ایک آدھ فقرہ لے کر اس پر الزامات کی ایک پوری عمارت کھڑی کر دیتے ہیں، اور اِس تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اُس شخص نے اپنی دوسری تحریروں میں اس مسئلے کے متعلق کیا لکھا ہے۔ یہ تحقیق اگر وہ کریں تو اُن کو خود معلوم ہو جائے کہ ان کے الزامات خالص افترا اور بہتان ہیں۔ بالفرض اگر وہ یہ عذر کریں کہ ہمارے پاس اِتنی تحقیق کی فرصت نہیں ہے تو اُن سے پوچھیے کہ دوسرے لوگوں پر الزامات چسپاں کرنا اور انہیں پھیلانا آپ پر کس نے واجب کیا ہے کہ یہ کام لامحالہ آپ کو کرنا ہی چاہیے۔

طعام المسکین کے معنی

سوال: سورۃ الحاقہ اور سورۃ ماعون کی آیت وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کا ترجمہ دونوں جگہ تفہیم القرآن میں مختلف ہے۔ ایک جگہ ترجمہ مسکین کو کھانا کھلانا کیا گیا ہے، اور دوسری جگہ مسکین کا کھانا دینا۔ اِس فرق کی کیا وجہ ہے؟

جواب: طَعام کا لفظ عربی زبان میں "کھانے" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز جو کھائی جاتی ہے۔ اور اِطعام کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، یعنی کھانا کھلانا۔

پہلے معنی کے لحاظ سے طعام المسکین کا مطلب ہے "مسکین کا کھانا" اور اس سے خود بخود یہ معنی نکلتے ہیں کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ اسی کا کھانا ہے، ذی استطاعت آدمی کے کھانے میں اس کا کھانا بطور ایک حق کے شامل ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہیے۔ یہی بات قرآن مجید میں ایک دوسرے طریقے سے یوں بیان کی گئی ہے کہ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور "اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حق ہے"۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب واضح ہے۔ ولا یحض علی طعام المسکین کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے کسی کو آمادہ نہیں کرتا۔

اسلامی نظامِ تعلیم

سوال: ۱۔ اسلامی نظامِ تعلیم سے کیا مراد ہے؟

۲۔ آپ کی نگاہ میں پاکستان کی بقاء و استحکام کے لیے اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟

۳۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف بڑھنے کی کوششوں کے راستے میں کونسی طاقتیں مزاحمت کر رہی ہیں؟

۴۔ آپ کے خیال میں گذشتہ ۲۷ برس میں پاکستان اسلامی نظامِ تعلیم کے قریب آیا یا دور ہٹا —؟

۵۔ آپ کے نزدیک اسلامی نظامِ تعلیم کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے کونسے اقدامات ضروری ہیں؟

تعلیمی، تہذیبی، ملّی - اور جغرافیائی زندگی پر اس نظریے کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہییں؟

۶ - "نورخاں تعلیمی پالیسی" کے نفاذ کی راہ میں کون سا بڑا رکاوٹ بنا؟

جواب: ۱ - اسلامی نظامِ تعلیم سے مراد ایسا نظامِ تعلیم ہے جس میں تعلیمی نصاب کے جملہ اجزاء کو اسلامی اصول و نظریات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو۔ معلمین و متعلمین دونوں کی دینی و اخلاقی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا ہو اور عربی زبان اور کتاب و سنت کی ضروری و اساسی تعلیمات کو نظامِ تعلیم کا جزو لازم قرار دیا گیا ہو۔

۲ - پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے سے ہو سکتا ہے کہ ملک و قوم کی قیادت ہمیشہ تعلیم یافتہ طبقے ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ان پڑھ یا نیم خواندہ طبقے اپنے قائدین ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کے بناؤ اور بگاڑ میں نظامِ تعلیم کو جو مقام حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

۳ - اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف پیش قدمی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ حکومت ہی ہے جو ایسے نظام سے واقف بھی نہیں ہے اور خائف و گریزاں بھی ہے۔

۴ - گذشتہ ۲۷ برس میں پاکستان اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف ایک قدم آگے بڑھا ہے تو دو قدم پیچھے ہٹا ہے۔

۵ - اسلامی نظامِ تعلیم کو بروئے کار لانے کے لیے دو طرح کے اقدامات ضروری ہیں - ایک وہ جو تعلیم گاہوں کے اندر سے شروع ہوں، دوسرے وہ جن کا آغاز باہر کی رائے عام کے دباؤ سے ہو۔ دونوں محاذوں پر پُرامن، منظم اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لیے سیاسی، معاشی، معاشرتی میدان میں جب تک اسلامی انقلاب رونما نہ ہوگا تعلیمی میدان میں تبدیلی آسان اور دیرپا نہ ہوگی۔

۶ - معلوم نہیں کہ نورخاں تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں کونسا ہاتھ رکاوٹ بنا؟

نبی کی آمدِ ثانی سے مراد کیا چیز ہوتی ہے؟

سوال: قادیانیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کا نظریہ مسلمانوں کی غلط فہمی ہے۔

ان کی جگہ مرزا صاحب مثیلِ عیسیٰ آچکے۔ مگر لوگوں نے انہیں نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا ان کے ساتھ سلوک کیا، حالانکہ دراصل آنے والے مرزا صاحب ہی تھے نہ کہ دو ہزار سال پہلے گزرے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

اِس خیال کی تائید میں تفہیم القرآن جلد ۴، صفحہ ۳۰۵ - ۳۰۶ کی عبارت پیش کی جاتی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

"حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السّلام کی بعثت کے زمانہ میں بالعموم یہودی تین آنے والوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاس دوسرے مسیح تیسرے "وہ نبی" ..... حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ ایلیاہ تو آچکا ..... اِس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاسؑ"۔

براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا نبی کی آمدِ ثانی سے مراد اس کے مثیل کی آمد ہوا کرتی ہے؟

جواب:۔ (از ملک غلام علی صاحب) تفہیم القرآن کی جس عبارت کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ اس سے قادیانی نبوت کی تصدیق یا مسلمانوں کے کسی اعتقاد کی تردید نہیں ہوتی۔ حضرت یحییٰ کا جو قول بائبل میں منقول ہے، اگر اس کی نسبت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت الیاس پہلے آچکے۔ اب الیاس یا ان کے کوئی مثیل نہیں آئیں گے بلکہ میں (یحییٰ) ایک دوسرا نبی مبعوث کیا گیا ہوں۔ اگر یحییٰ علیہ السّلام یہ کہتے کہ میں مثیل الیاس ہوں اور میرے آنے کو الیاسؑ ہی کی آمدِ ثانی سمجھو جبکہ وہ فوت ہو چکے ہیں، تب البتہ قادیانی اپنے حق میں کوئی بات بنا سکتے تھے۔

یہ قادیانیوں کی کھلی اور گمراہانہ تاویل بازی ہے کہ وہ ایسے تنکوں کا سہارا لے کر اپنی نبوت کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ مسلمان مسیح ابن مریم کی آمد کے قائل ہیں، کسی مثیل مسیح کی پیدائش کے قائل نہیں ہیں۔ حدیث میں بھی ابن مریم کے نزول کا ذکر ہے، کسی مثیل مسیح یا مسیح موعود کا ذکر نہیں۔ یہ مثیل، بُروز وغیرہ کا تصوّر خالص ہندوانہ اور مشرکانہ ہے۔ یہ وہی اوتار یا تبّت کے دلائی لامہ والا عقیدہ ہے جس کے مطابق ایک رُوح مختلف قالب اور جامے بدل بدل کر دنیا میں بار بار آتی رہتی ہے۔ ہمارے نزدیک جب آئیں گے تو حضرت عیسیٰ ابن مریم ہی آئیں گے جنہیں نبوت عطا ہو چکی تھی اور اس پر ہم پہلے ہی ایمان رکھتے ہیں۔

ذبیحہ کے لیے تسمیہ شرط ہے یا نہیں؟

سوال: ایک خاص مسئلے کی وجہ سے آپ کا قیمتی وقت لینا چاہتا ہوں۔ یہاں کینیڈا میں مشرق اوسط سے آئے ہوئے عرب بھائیوں نے یہ موقف اختیار کر رکھا ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ جسے قرآن میں حلال قرار دیا گیا ہے، اُس کے تحت وہ تمام گوشت آجاتا ہے جو یہاں کی دکانوں میں فروخت ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر یا بسم اللہ کہنا ضروری نہیں ہے کیونکہ تسمیہ ذبح کے لیے شرط نہیں۔ جو گوشت بھی مشینوں سے کٹ کر بازاروں میں آتا ہے اُسے کھاتے وقت بسم اللہ کہہ دینا کافی ہے۔

جواب: (از ملک غلام علی صاحب) عرب دوستوں کی یہ بات عجیب و غریب ہے کہ ذبح کے لیے تسمیہ شرط نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہی جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُسے مت کھاؤ (انعام: ۱۲۱)۔ اہل کتاب کا ذبیحہ اور طعام انہی شرائط کے تحت حلال ہے جو قرآن میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں۔ ورنہ اہل کتاب کے کھانے میں خنزیر بھی تو ہوتا ہے۔ اگر اہل کتاب کا کھانا (طَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ) مطلقاً حلال ہو تو خنزیر کو بھی حلال ہونا چاہیے تھا۔ ان کے طعام کی حلت کے متعلق حکم ایسا مطلق نہیں ہے جسے دوسرے قرآنی احکام مقید نہ کرتے ہوں۔ ہمارے ائمہ میں صرف امام شافعی کا ایک قول مروی ہے کہ مسلمان اگر اللہ کا نام نہ لے تب بھی اس کا ذبیحہ حلال ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ اور نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کر رہا ہے، اس لیے اس کا زبان سے ذکر نہ کرنا حلت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ سے اس کے بالمقابل دوسرا قول بھی مروی ہے جس میں تسمیہ کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ میرے علم میں کوئی دوسرا امام یا فقیہہ نہیں جو بغیر تسمیہ کے ذبیحہ اہل کتاب کو حلال سمجھتا ہو۔